مقالات

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

قسط آخری

عجمی تصوّرات کا تیسرا دور

اطاعتِ رسول کا پرویزی مفہوم:

یہ ہے رسولؐ کا صحیح مقام اور اطاعتِ رسولؐ کا صحیح مفہوم۔ اب دیکھیے جناب پرویز صاحب اطاعتِ رسول سے کیا مراد سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں:

"مقلد ائمہ ہوں یا مقلدِ روایات۔ تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے، کہ ہم رسول اللہ یا صحابہ کبار یا ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسول اللہ و صحابہ کبار یا ائمہ فقہ کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل خود تلاش کیجیے"

(تاریخ اسباب زوال امت، ص ۱۰۱)

تقلید دراصل نبی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی غیر مشروط اور بلا دلیل اطاعت کا نام ہے جو جائز نہیں۔ اقتباس بالا میں آپ نے نہایت چابکدستی سے تقلید کا لفظ ائمہ و فقہائے کے ساتھ صحابہؓ اور اس سے بڑھ کر رسول اللہ کی اطاعت پر بھی استعمال کر کے، تقلید جیسے بدنام لفظ سے دھوکہ دینے اور مسلمانوں کو اطاعتِ رسولؐ سے برگشتہ کرنے کی جسارت کی ہے اور اس سے بھی قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ کیا خود سوچنے میں سارے مسائل کا حل موجود ہے؟ اگر "خود سوچنے" ہی کی بات تھی تو رسولؐ اللہ نے افک کے معاملہ میں مہینہ بھر کیا سوچا؟ اور اتنی پریشانی کیوں برداشت کی؟ جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والوں پر پورے پچاس دن کیوں سختی کی جاتی رہی؟ آپؐ نے خود سوچ کر اس کا حل کیوں نہ پیش فرمادیا؟

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک دادی اپنے پوتے کے ترکہ کا حصہ لینے آئی تو آپ نے اس کا خود کیا حل سوچا؟ حضرت عمرؓ اور دوسرے تمام اہلِ شوریٰ کے علی الرغم حضرت ابوبکرؓ کو کس بات نے نامساعد حالات میں لشکرِ اسامہؓ کو بھیجنے اور مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ لڑنے پر

آمادہ کیا؟ یہ اور ایسے بیشمار واقعات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مسائل "خود سوچنے" یا مشورہ کرنے سے ہی حل نہیں ہو پاتے، انہیں ہر مقام پر کتاب وسنت سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی اور وہ یہ روشنی حاصل کرتے رہے؟ اور سنت سے روشنی حاصل کرنے اور اس کی اتباع کا نام تقلید نہیں۔

ائمہ فقہاء بھی ہر معاملہ میں کتاب وسنت کو اپنے اجتہاد کا ماخذ قرار دیتے تھے۔ اگر کتاب کے ساتھ سنت کو بھی ماخذ قانون بنانے کو آپ تقلید کا نام دے دیں تو بلاشبہ وہ سب مقلد تھے، ان ائمہ میں امام ابوحنیفہؒ مشکوک احادیث کو قبول کرنے میں نسبتاً سختی برتتے تھے، تاہم ان کے اس قول؛

"اترکوا قولی بخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"!

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مل جائے تو میرے قیاس کو چھوڑ دو"

سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:

۱۔ وہ احادیثِ رسولؐ کو شرعی قانون کا ماخذ تسلیم کرتے تھے۔

۲۔ اپنی تقلید سے لوگوں کو روکتے تھے۔

اور امام ابوحنیفہؒ پر ہی کیا موقوف ہے۔ سب ائمہ فقہاء اپنی تقلید سے منع کرتے رہے۔ اب اگر ان ائمہ کے متبعین ان کی تقلید کرنے لگ جائیں تو اس میں ائمہ کا کیا قصور؟

سنتِ رسولؐ کی پیروی سے برگشتہ کرنے کے بعد پرویز صاحب اسوۂ حسنہ کو ہی سرے سے غائب کر دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو جو اس ذاتِ گرامی سے عقیدت ومحبت ہے اسے بھی کلیۃً ختم کر دینا چاہتے ہیں، لکھتے ہیں:

مقامِ رسالت پرویز صاحب کی نظر میں:

"توحید کے بعد رسالت حضور ختم المرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن رسول پر ایمان لانے سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں کیونکہ اس کی ذات تو مکان وزمان کے حدود کی پابند ہوتی ہے اور ملتِ اسلامیہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، ابدیت سے ہمکنار ہے"..... رسالتِ محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے جو حضورؐ کی وساطت سے امت کو ملی۔" (فردوسِ گم گشتہ ص۳۸۳)

چلیے، حضورِ اکرمؐ کی ذات پر ایمان لانے کا بھی قصہ پاک ہوا اور رسالتِ محمدیہ پر ایمان

لانے کا بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ڈاکیہ یا زیادہ سے زیادہ ایک مبلّغ کی حیثیت سے آئے اور قرآن امت کے حوالہ کیا اور دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اب ان کے اس اُسوۂ حسنہ کی ضرورت بھی کیا ہے؛ وُہ بھی گئے ساتھ نبوت بھی رخصت ہوئی اور رسالت بھی کیونکہ آپؐ خاتم النبیین بھی تھے اور خاتم المرسلین بھی۔

نبی اور رسول میں جو فرق ہوتا ہے اس کی تفصیل ہم پہلے بتلا چکے ہیں۔ لیکن پرویز صاحب کی تعلیمات کے مطابق نبی اور رسول میں کچھ فرق نہیں۔ جو نبی ہے وُہ رسول بھی ہے اور جو رسول ہے وُہ نبی بھی۔ فرماتے ہیں؛

> "نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ایک قوت ہے، دوسری اس کی عملی تفسیر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول۔" (سلیم کے نام سولھواں خط ص ۲۶۴)

.....مگر رسالت بدستور جاری ہے:

ایک طرف تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں، لیکن دُوسری طرف آپ اس "ایک ہی حقیقت" کے دونوں رُخوں کو جُدا جُدا کرنا چاہتے ہیں، یعنی نبوت کو تو حضور اکرمؐ کے ساتھ ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں اور رسالت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:

> "نبوت شخصیت کی مظہر ہوتی ہے اور رسالت آئیڈیالوجی کی نقیب۔ نبی اکرمؐ کے بعد نبوت ختم ہو گئی مگر رسالت باقی رہ گئی۔ اس لیے کہ اب انقلاب کا مدار رسالت پر تھا نہ کہ شخصیتوں پر۔ آئیڈیالوجی حروف و نقوش کی شکل میں محض مجرد تصور ہوتی ہے۔ اس کی عملی صورت نظام کہلاتی ہے۔ لہٰذا یوں سمجھو کہ ختم نبوت کے بعد اشخاص کی جگہ نظام نے لی۔ مگر رسالتِ محمدیہ قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ لیکن مسلمان اس سے دُور ہی نہیں بلکہ اس کی راہ میں روک بنا کھڑا ہے ختم نبوت کی اہم مدت ہوتی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے اس لیے اس نے رسالت کو ایک عرصہ سے پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔" (سلیم کے نام چودھواں خط ص ۲۳)

اب دیکھیے اس اقتباس میں رسالت محمدیہ کو کیسے غلط معنی پہناتے جا رہے ہیں۔ اگر رسالتِ محمدیہ باقی ہے اور قیامت تک آپؐ رسول ہیں تو اس لحاظ سے نبوت محمدیہ بھی باقی ہے کیونکہ آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آنے کا۔ پھر جب آپؐ خاتم النبیین اور ختم المرسلین

ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نبوّت اور رسالت دونوں ختم ہو چکے ہیں۔ البتہ اس رسالت کی تبلیغ کا کام باقی ہے جو آپؐ سے لے کر آج تک ہوتا رہا اور آئندہ قیامت تک ہوتا رہے گا اور تبلیغ و رسالت میں جو فرق ہے وہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں۔

شیخ ابن عربی نے بھی حضور اکرمؐ کی دو الگ الگ حیثیتیں قرار دیں، ایک نبوت دوسرے ولایت، پھر اس نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ ولایت نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ حضور اکرمؐ خاتم الانبیاء تھے اور خاتم الاولیاء کی گدی شیخ موصوف نے خود سنبھال لی۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے رسالت کو تو ختم کیا مگر نبوّت کو جاری رہنے دیا اور بتدریج اس نشست پر خود براجمان ہوئے۔ اب پرویز صاحب نبوّت کو ختم کرتے ہیں لیکن رسالت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ حضور اکرمؐ کی سنت یا اسوۂ حسنہ، ان سے عقیدت و محبت ختم کرنے کے بعد رسالت کی نشست پر پرویز صاحب خود براجمان ہونے کے لیے کیسے راہ ہموار کرتے ہیں؟۔ فرماتے ہیں:

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے مراد:

"چونکہ نظامِ دین میں اللہ کے احکام مرکز سے نافذ ہوتے تھے اور یہ مرکزی قوتِ نافذہ رسول کی مخصوص شخصیت میں تھی، اس لیے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت قرار دیا گیا ..... لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکزی نظامِ دین Central Authority ہے جہاں سے احکامِ قرآنی نافذ ہوں۔" (معراج انسانیت ص ۶۱۶) ..... "ان تصریحات سے واضح ہے کہ نظامِ قرآنی میں اطاعت مرکزِ ملت کی ہے اور چونکہ یہ مرکز قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کرتا ہے اور پہلا مرکز رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تھی اس لیے قرآنِ کریم میں مرکزِ ملت کو اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔" (معراج انسانیت ص ۶۳۱)

اب ظاہر ہے کہ یہ مرکزِ ملت بھی کوئی "شخص" یا اشخاص ہی ہوں گے جن کو اللہ اور رسول دونوں کے جملہ حقوق تفویض کیے جا رہے ہیں۔ اس کی تشریح بزمِ طلوعِ اسلام کے ایک معزز رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی زبانی سن لیجئے تاکہ کچھ شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ آپ طلوعِ اسلام کنونشن میں خطاب فرماتے ہیں، عنوان ہے "طلوعِ اسلام نے ہمیں کیا دیا؟"

زندہ رسول: "عملی انتظام کی سہولت کے لیے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو نمائندہ

بناکر "فیکم رسول" [1] کے سلسلہ کو قائم رکھتی ہے اور یہ کہ رسول کی زندگی کے بعد "فیکم رسول (۴۹)" سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے۔"

(طلوعِ اسلام جون ۱۹۵۹ء)

یہ تو اس مرکزِ ملت شخصیت کا ایک پہلو تھا کہ وہ فی الواقعہ زندہ اور جیتا جاگتا رسول ہے، جو ہمارے درمیان موجود ہے۔ اب اس مرکزِ ملت کے خدا ہونے کے پہلو پر بھی انہی ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

"اگر کسی فرد سے لغزش ہو جائے تو مسجد کے گوشے میں استغفر اللہ کہنے سے معافی نہیں مل سکتی، بلکہ اس فرد کو خود چل کر مرکزی اتھارٹی کے پاس آنا ہوگا اور معذرت پیش کرنا ہوگی۔

(طلوعِ اسلام کنونشن میں ڈاکٹر موصوف کا خطاب بعنوان پاکستان کا مسئلہ طلوع اسلام جولائی ۱۹۶۳ء)

اب ادارہ طلوعِ اسلام کے ایک اور معزز رکن جناب محمد علی خاں بلوچ کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

بلوچ صاحب نے جب اپنی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھ لی کہ مرکزِ ملت یعنی جناب پرویز صاحب فی الواقعہ "رسولِ اکرم" کی نشست پر براجمان ہو گئے ہیں تو آپ کو غالباً پرویز صاحب کی یہ ادا پسند نہیں آئی، فرماتے ہیں:

زندہ رسول اور جناب پرویز صاحب:

غالباً ہماری طرح آپ حضرات میں سے بہت سوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے اس وجہ اشتراک کے پردہ میں کہ جس طرح رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی میں نوعِ انسانی کو قرآن کریم کی دعوت دی تھی۔ آج کل اسی طرح گلبرگ لاہور کی کوٹھی نمبر ۲۵ بی میں جناب پرویز صاحب بھی

---

[1] یہ الفاظ سورۃ حجرات کی آیت نمبر ۷ سے لیے ہیں، اس سورہ میں صحابہ کرام کو حضور اکرمؐ کے ادب و احترام کے آداب سکھلائے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے خطاب فرماتے ہیں:

"واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم" (۴۹/۷) اور جان رکھو کہ تم میں خدا کے پیغمبر ہیں اگر بہت سی باتوں میں وہ تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔"

اب آیتِ بالا کے اس ٹکڑے میں سے فیکم رسول کے لفظ نکال کر اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہر دور میں ایک رسول کی موجودگی ضروری ہے۔ جب تک مسلمان اس دنیا میں موجود ہیں تو پھر حضور ختم المرسل کیسے ہوئے؟

قرآن کی دعوت دے رہے ہیں۔ جناب پرویز صاحب اپنے آپ کو آں حضرتؐ کے بلند مقام پر فائز کر کے ان تمام آیات کو جو آں حضرتؐ سے متعلق ہیں، اپنی ذات پر منطبق فرما لیتے ہیں۔ پھر جو آیاتِ قرآنی مخالفینِ اسلام اور کفار سے متعلق نازل ہوئیں انہیں نہایت چابکدستی سے اپنے مخالفین پر چسپاں کر دیتے ہیں، حالانکہ کجا حضور ختمی مرتبت علیہ السلام اور کہاں جناب پرویز ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم خاک

دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں پیدا کی جا سکتی۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جناب پرویز احساسِ کمتری کا شکار ہیں اور اس طرح وُہ خود کو رسولِ اکرم کے مقام بلند پر فائز کر کے اپنے لیے عوام کی نگاہوں میں غلط طریقہ پر کچھ جھوٹا وقار حاصل کرنے کی سعی نامشکور فرماتے ہیں یا انہیں ارشاداتِ نبویؐ سے نفرت کرتے کرتے خود ذاتِ نبویؐ سے بھی ایک قسم کی کد ہو گئی ہے کہ وُہ آں حضرتؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کو ایک آدمی کی سطح پر بلکہ خود اپنی کی سطح پر کھینچ لے آنے پر مصر ہیں۔ دونوں صورتوں میں جونسی صورت بھی ہو، ہر صورت قابلِ اعتراض اور لائق نفرین ہے۔ (حدیثِ دل گداز سے ص ۳۰)

موجودہ نبی اور رسول کا تقابل:

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز میں صرف نام کی ہی مشابہت نہیں اور بھی بہت سی باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ قادیانی صاحب بھی ابتداءً ختم نبوت کے قائل تھے، پرویز صاحب نے بھی نبوت اور رسالت کو ایک ہی سکہ کے دو رُخ قرار دے کر حضور اکرمؐ کو خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین تسلیم کیا ہے

۲۔ قادیانی صاحب نے بعد میں یہ کہہ کر کہ "ہمارا مذہب تو یہ ہے، جس دین میں نبوت کا سلسلہ نہ ہو وُہ مردہ ہے" (حقیقۃ النبوۃ ص ۲۷۲) نبوت کا دروازہ کھول دیا اور پرویز صاحب نے یہ کہہ کر کہ "ملتِ اسلامیہ ابدیت سے ہمکنار ہے" کہہ کر رسالت کا دروازہ کھول دیا۔

۳۔ دونوں صاحبان نے بتدریج نبوت اور رسالت کی گدی پر قبضہ جمایا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قادیانی صاحب جب اپنی سابقہ تحریروں کے علی الرغم لوگوں　　　　ہیں تو زبان مبہم اور الہامانہ استعمال کرتے ہیں لیکن پرویز صاحب پیچیدہ اور فلسفیانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ دونوں نے خدا کے تصور میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ قادیانی صاحب تو خُدا کو اتنا اجاگر کرتے ہیں کہ وُہ خود اسے دیکھتے ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی دکھلا سکتے ہیں۔ بقول میاں محمود خلیفہ ثانی

"ایسی صورت میں تو ایک ہی علاج ہو سکتا ہے اور وُہ یہ کہ لوگوں کے گلے پکڑ کر ان کی آنکھیں اوپر کو اٹھا دی جائیں اور کہا جائے کہ وُہ خدا ہے جس نے اپنے تازہ نشانات سے دُنیا پر اپنے وجود کو ثابت کیا" (الفضل قادیان ۱۹ر جولائی ۱۹۳۶ء) جبکہ پرویز صاحب خدا کو اتنا گم کر دیتے ہیں کہ خدا کو محض ایک تجریدی تصور کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۵۔ قادیانی صاحب نے قادیان کو ارضِ حرم قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

زمینِ قادیاں ارضِ حرم ہے ہجومِ خلق سے اب محترم ہے

تو پرویز صاحب نے اپنی جائے سکونت کو حرم، کعبہ اور مکہ سب کچھ ہی قرار دے دیا، فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد حرم کی پاسبانی ہے، سیاسی معاہدات نہیں۔ واضح رہے کہ حرم، کعبہ، مکہ سے مراد سعودی عرب کا دار السلطنت نہیں بلکہ دین کے نظام کا مرکز ہے۔ جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہوں گے۔" (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۱ء)

اور یہ تو آپ بزمِ طلوعِ اسلام کے معزز اراکین کی شہادتوں سے معلوم کر ہی چکے ہیں کہ وُہ مرکز آپ ہی کی ذاتِ والا صفات ہے۔

۶۔ دونوں پر امتِ مسلمہ کے سب فرقوں نے متفقہ طور پر کفر کا فتوےٰ لگایا۔ قادیانی جماعت تو مسلم اقلیت قرار دی جا چکی ہے۔ پرویز صاحب پر جب فتوےٰ لگایا گیا تو فرماتے ہیں:

"ان حضرات (علماء) کو یا کسی اور کو یہ اتھارٹی کہاں سے مل جاتی ہے کہ وُہ کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کریں؟ علماء کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے کسی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وُہ جسے چاہیں کافر قرار دے دیں" (کافر گری ص ۲۳ از پرویز صاحب)

۷۔ لیکن ان دونوں صاحبان نے خود کافر گری کا یہ حق جی بھر کر استعمال کیا ہے۔ قادیانی صاحب اپنی نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو یا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ اور پرویز صاحب کی کافر گری محمد علی بلوچ صاحب کے اقتباس سے واضح ہے۔ آپ نے خود بھی قرآنی نظامِ ربوبیت میں اس نظام پر ایمان نہ لانے والوں کو کئی مقام پر کافر بنا دیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مرکزِ ملت کا یہ منشور غلط ہے!

اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ ملت یا اللہ اور رسول کی اطاعت

سے مراد مرکزِ ملت کی اطاعت ہے ؛ بالفاظ دیگر کیا مرکزِ ملت اللہ اور رسول کا مقام سنبھال سکتا ہے؟ تو یہ تصور بوجوہ غلط ہے۔

۱۔ رسول مامور من اللہ ہوتا ہے جبکہ مرکزِ ملت ایک عام شخص یا چند اشخاص جنھیں لوگ منتخب کریں گے۔

۲۔ رسول احکام الٰہی پر عمل پیرا ہو کر جو عملی نمونہ پیش کرتا ہے اس میں کوئی لغزش یا جھول رہ جائے تو اس کی فوری طور پر بذریعہ وحی اصلاح کر دی جاتی ہے جبکہ مرکزِ ملت کی غلطیوں کی ایسی درستی کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور کسی انسان کے متعلق یہ تصور ممکن ہی نہیں کہ اس سے کوئی غلطی نہ ہوتی ہو۔

۳۔ رسول اللہ کے بعد پہلے مرکزِ ملت حضرت ابوبکرؓ تھے۔ آپ نے اپنے آپ کو نہ تو اللہ اور رسول سمجھا نہ محض رسول سمجھا تو خلیفۂ رسول سمجھا۔ زندگی بھر اسوۂ رسول کو سامنے رکھا اور اس پر سختی سے کاربند رہے۔ یہی حال دوسرے خلفاء راشدین (مراکزِ ملت) کا رہا تو آج اسوۂ حسنہ کو سامنے سے ہٹا کر قرآنی احکام کی تفصیل و تشریح کے اختیارات کسی مرکزِ ملت کو کیسے تفویض کیے جا سکتے ہیں۔؟

اللہ اور رسول کی الگ الگ اطاعت کا تصور :

معراجِ انسانیت میں پرویز صاحب نے بیسیوں صفحات اس بات کی وضاحت میں سیاہ کر دیے ہیں کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد اللہ ہی کی اطاعت ہے اور مثالوں سے واضح فرمایا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے حکم کے بعد تثنیہ کے بجائے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اب دیکھیے اس عبارت میں مغالطہ یہ دیا جا رہا ہے کہ رسول کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ وُہ اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ مقصود اللہ کی اطاعت ہے رسول کی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے۔ (من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰) اور رسول کی اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر قرآن کی اطاعت کا تصور رسولؐ کے اسوہ کے بغیر ناممکن ہے اور نیز یہ کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت میں جو تثنیہ کے بجائے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تو اس ضمیر واحد کا مرجع اللہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہوتا ہے گویا قرآن اور اسوۂ حسنہ دونوں کی اتباع کا نام اطاعتِ رسول ہے اور یہی اطاعتِ رسول عین اللہ کی اطاعت ہے۔

پرویز صاحب نے یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ مسلمان اللہ کی اطاعت سے مراد قرآن

کی اطاعت لیتے ہیں اور رسول کی اطاعت سے مراد احادیث کی اتباع۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔ مسلمانوں میں اللہ اور رسول کی الگ الگ اطاعت کا کوئی تصور نہیں۔ بلکہ رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت عبارت ہے قرآن اور اسوۂ حسنہ سے۔ اس طریق اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت کا کوئی تصور مسلمانوں میں موجود نہیں۔ قرآن کے الفاظ پر پھر غور فرمائیے، اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ "جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی" یہ نہیں فرمایا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی تو اس نے گویا رسول کی اطاعت کی۔

اب اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کی تشریح بھی پرویز صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کی نئی تشریح:

اس آیتِ مقدسہ میں عام طور پر اولی الامر سے مراد لیے جاتے ہیں ارباب حکومت (مرکزی اور ماتحت سب کے سب) اور اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اگر قوم کو حکومت سے اختلاف ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور حدیثِ (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دنیا میں کوئی نظام حکومت اس طرح سے قائم بھی رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے، اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن و حدیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔ اس آیتِ مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے جس میں اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکزِ ملت ہے، اور اولی الامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جاتے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو امر متنازعہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو، اسے مرکزی حکومت کی طرف Refer کر دو۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لیے واجب التسلیم ہو گا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف عدالتِ عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے" (معراجِ انسانیت ص ۶۲۵، ۶۲۶)

اقتباس بالا میں کئی ایک مغالطے ہیں اور کئی وجوہ سے غلط ہے، مثلاً:

۱۔ اللہ سے قرآن اور رسول سے مراد احادیث قطعاً غلط ہے۔ کتاب اللہ کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کی اطاعت ہے اور اسوۂ حسنہ جو کتاب اللہ کے احکام کی عملی شکل ہے کی پیروی بھی عین اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ اللہ کے احکام اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ یہ دونوں چیزیں ہمیں۔ کتاب اللہ میں بھی ملتی ہیں اور احادیث میں بھی۔

۲۔ اگر مرکزِ ملت سے مراد اللہ اور رسول ہی ہے تو خلفائے راشدین نے خود عدالتوں کی طرف کیوں رجوع کیا جہاں سے فیصلے بھی ان کے خلاف صادر ہوئے؟ حضرت عمرؓ کا حضرت عبداللہ بن عباس سے جھگڑا ہوا تو حضرت ابی بن کعب نے حضرت عمرؓ کے خلاف فیصلہ دیا۔
اور حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے خلاف زرہ کا مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں دائر کیا تو آپ کا مقدمہ ہی خارج کر دیا گیا۔

۳۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرکز ملت کی شخصیت بھی اولوالامر میں شامل ہیں، جن سے جھگڑا کیا جاسکتا ہے وُہ رسولؐ یا اللہ اور رسول نہیں بن جاتے، کیونکہ ان سے تو اختلاف اور جھگڑا ایمان سے ہی خارج کر دیتا ہے جبکہ اولوالامر سے اختلاف اور جھگڑا ہونے سے ایمان میں کچھ حرج واقع نہیں ہوتا۔

۴۔ مرکزِ ملت قطعاً عدالت مرافعہ نہیں۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو عدالت میں حاضر ہونے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

۵۔ عدالت مرافعہ (جیسی اور جس درجہ کی بھی ہو) وُہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ اس پر مرکزِ ملت کی شخصیت اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات فی الواقعہ عدالت مرافعہ تھی۔ اس لحاظ سے نہیں کہ وُہ مرکزِ ملت تھے بلکہ اس لحاظ سے کہ وُہ اللہ کے رسول تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر مرکزِ ملت کو رسول کی گدی پر بٹھلانا اور اسے اولوالامر کے زمرہ سے خارج کر دینا ایک ایسا غلط تصور ہے جس کی تائید قرآن، حدیث اور تاریخ کسی سے بھی نہیں ہوتی۔

مرکزِ ملت کا تصور پیش کرنے کی غرض و غایت:

پرویز صاحب کی مختلف تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایسے علمائے دین سے سخت دشمنی ہے جو قرآن کی تاویل و تعبیر میں اسوۂ حسنہ اور دیگر ائمہ فقہا سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ آپ انہیں ہندوؤں یا عیسائیوں کی پیشوائیت کے بدنام لفظ سے موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ مزعومہ پیشوائیت

اور علمائے دین میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ مثلاً

۱۔ پیشوائیت میں علم دین کی اجارہ داری ایک مخصوص طبقہ یا خاندان سے متعلق ہوتی ہے جبکہ اسلام میں کوئی شخص بھی خواہ وہ جولاہا یا چمار ہی کیوں نہ ہو۔ علم حاصل کر کے علماء کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

۲۔ پیشوائیت میں یہ طبقہ معاشرتی لحاظ سے بلند مقام پر فائز ہوتا ہے جبکہ اسلام میں بزرگی کا معیار محض علم نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

۳۔ پیشوائیت میں اس طبقہ کی آراء کو سند سمجھا جاتا ہے جبکہ اسلام میں کوئی بات جو قرآن و سنت کے خلاف ہو خواہ کتنے ہی بڑے امام کی ہو۔ سند نہیں ہوتی اور اسے زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

تاریخ سے ایک مرکز ملت کی مثال :

بہرحال آپ علمائے دین کے پیچھے اس لیے پڑے ہیں کہ یہ لوگ قرآن کی من مانی تاویل و تفسیر میں آڑے آجاتے ہیں۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ادارہ طلوع اسلام کو ایک ایسا کردار نظر آیا ہے، جس نے علمائے دین کی زبان بند کر دی تھی۔ یہ شخصیت شہنشاہ اکبر اعظم کی ہے دیکھیے صفدر سلیمی صاحب مصنف "پاکستان کا معمار اول۔ سرسید" اس کی تعریف میں کیسے رطب اللسان ہیں۔ آپ پہلے ملا بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں :

"اس کے بعد کوئی ایسا مسئلہ جس میں مجتہدین کی آراء ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور سلطان اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر رعایا کی بہبود اور سیاسی مصالح کے پیش نظر ان باہم متعارض و متضاد آراء میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے اس کے مطابق احکام صادر کر دے تو ان احکام کی اطاعت ہم پر اور تمام رعایا پر فرض ہو گی نیز اگر سلطان کوئی نیا حکم جاری کرنا چاہے تو ہم پر اور دیگر رعایا پر اس کی اطاعت بھی فرض ہو گی۔ بشرطیکہ وہ حکم قرآنِ پاک کی آیات کے مطابق ہو اور اس سے مقصود رعایا کی بہبود ہو۔"

اس اقتباس کے بعد اب صفدر سلیمی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے :

"اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کو قرآن کی حدود میں مقید رکھا گیا تھا اور یہ چیز عین اسلام کے مطابق ہے اور فقہاء کی بحث میں فیصلے کا حق رئیس مملکت کو حاصل ہونا اسلام کی قانون سازی کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں علماء یا

کسی اور کو قاضی کا منصب حاصل نہیں ہوتا۔ فیصلے کا اختیار یا تو مملکت کی طرف سے مقرر کردہ جج کو ہوتا ہے یا خود حکومت کی مرکزی اتھارٹی کو اس شرط کے ساتھ کہ ان کا فیصلہ قرآن کے خلاف نہیں ہو گا۔ اکبر کا یہ فیصلہ ان دونوں شرطوں کو پورا کرتا ہے اور اسلام کے عین مطابق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علما۔ نے اکبر کے خلاف جو طوفان برپا کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وُہ انہیں ان کے صحیح مقام پر رکھنا چاہتا تھا اور انہوں نے جس انداز کی تھیاکریسی قائم کر کے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا، وُہ اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیز اکبر کے دور کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ تاریخ میں جس شخص نے بھی یہ کوشش کی کہ علما۔ کو ان کے مقام سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ انہوں نے بیشتر اس کی مخالفت کی۔"

(طلوعِ اسلام اگست ستمبر ۱۹۶۴ء)

اب دیکھیے کہ اس سلطان کی خداداد بصیرت یہ تھی کہ وُہ آفتاب پرست تھا۔ شب و روز یعنی ۲۴ گھنٹے میں چار دفعہ سورج کے سامنے ہاتھ باندھ کر پُوجا پاٹ کرتا تھا۔ ماتھے پر تلک لگاتا تھا۔ محل سرا میں ہندو بیوی تھی، مندروں میں جا کر عبادت کرتا تھا۔ کیا یہ سب افعال و اعمال قرآن کے مطابق ہیں؛ پھر اس کے ایسے اعمال و افعال صرف اپنی ذات تک محدود نہ تھے۔ وُہ دینِ الٰہی کا بانی تھا جو ظاہر ہے کہ دینِ اسلام سے کوئی جداگانہ چیز تھی۔ اس نئے دین کی نشر و اشاعت کے لیے وُہ تمام ذرائع حکومت استعمال میں لاتا رہا۔ یہی وُہ سلطان ہے جس کے دربار اور حرم میں ہر وقت السلطان ظل اللہ کا نعرہ گونجتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پُوری اسلامی تاریخ میں اکبر جتنا ملحد کوئی پیدا نہیں ہوا۔ مگر طلوعِ اسلام اسے صرف اس لیے خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے کہ آپ کے پیش کردہ تصورِ مرکزِ ملت کا وُہ پیکرِ محسوس تھا اور علماء کو اس نے ان کے جائز مقام پر رکھا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ طلوعِ اسلام اس بات کی وضاحت فرما دیتا کہ علماء کا جائز مقام ہے کیا؟ کیا علمائے دین کا جائز مقام یہ ہے کہ ان کی اس حد تک زبان بندی کر دی جائے کہ کوئی مرکزِ ملت اپنی "قرآنی بصیرت" کے مطابق جو بھی من مانی تاویلات کرتا پھرے تو انہیں آواز نکالنے کی جرأت بھی نہ ہو؟

ادارہ طلوعِ اسلام نے ملوکیت کو بھی اپنی اکثر تحریروں میں ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اکبر تو بادشاہ ہی نہیں شہنشاہ تھا جس کا باپ بھی بادشاہ تھا وُہ خود بھی بادشاہ تھا اور اس کا بیٹا بھی بادشاہ۔ ظل اللہ علی الارض بھی تھا اور مشرک و بت پرست بھی۔ لیکن ان سب قباحتوں کے باوجود ادارہ طلوعِ اسلام کو اکبر کی یہ ادا ـــــ کہ وُہ علماء کو ان کے جائز مقام پر رکھتا تھا ـــــ اتنی پسند آئی کہ اس کی تعریف میں ڈونگرے برسانے لگے ہیں۔ کیا یہی ان کی قرآنی بصیرت کا تقاضا ہے۔؟